R. N. 2186/57 | Regd. No. A. 923

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

قیمت
سالانہ ... روپے
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
۸-۱۰-۶۲

ہماری زبان

جلد ۲۱ - شمارہ ۳۸ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۸ر اکتوبر ۱۹۶۲ء

الطاف احمد خلیری

دلکش جے پور

جے پور، جہاں انجمن ترقی اُردو کی کل ہند اردو کانفرنس ۲۴-۲۵ نومبر ۱۹۶۲ء کو منعقد ہو رہی ہے اعہد یوں سے راجپوتانہ کا ثقافتی مرکز اور شروع ہی سے علوم و فنون اور صنعت و حرفت کا مخزن رہا ہے۔ موجودہ دور میں جے پور نہ صرف راجستھان کا دارالحکومت ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ گنجان اور بارونق شہر بھی ہے مگر اس حسین اور دلکش شہر کی عالمگیر شہرت ان اضافتوں کی رہین منت نہیں ہے، جیسا کسی ظریف نے کہا ہے :-

"جے پور کی سب سے بڑی دل کشی شہر جے پور ہے"

سالہا سال سے بے شمار غیر ملکی اور ملکی سیاح ہر سال جے پور آتے ہیں۔ اور آگرہ اور دہلی کے بعد شمالی ہند کے سیاحی مرکزوں میں غالباً جے پور ہی کا درجہ ہے۔

بہت سے ممتاز سیاحوں نے جے پور کو مختلف لقب دئے ہیں کسی نے اسے ایک "خواب سنگ" کہا ہے تو کسی نے "شہر یک ہزار و طاؤس"۔ اکثر نے اس کو "ہند کا گلابی شہر" کہا ہے۔ اور یورپ اور امریکہ میں جے پور "شہر گلابی" کے لقب سے زیادہ معروف ہے۔

جے پور کی تاسیس ۱۷۲۸ء میں ایسے دور میں ہوئی جب منصوبہ بندی دائج نہ تھی۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ جے پور کو ایک باقاعدہ منصوبے کے ماتحت بسایا گیا۔ اس کے بانی مہاراجہ سوائے جے سنگھ ثانی ایک مشہور ہیئت داں ماہر ریاضی اور عالم و فاضل تھے۔ اُن کو فلکیات سے بہت گہری دلچسپی تھی۔ کہتے ہیں کہ اول انہوں نے ایک رصدگاہ بنائی اور اس کے بعد اپنے ریاضی کے رجحانات کے باعث اس شہر کو ریاضیاتی صحت و باضابطگی سے بسایا۔ بعض کا خیال ہے کہ مہاراجہ موصوف نے قسطنطنیہ کو، جسے اب استانبول کہتے ہیں، اپنا نمونہ منتخب کیا تھا۔ بہر حال یہ واقعہ ہے۔ جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی مشہور تصنیف "ڈسکوری آف انڈیا" میں لکھا ہے :-

"شہر جے پور ایسی خوبی اور دانشمندی سے ترتیب پا گیا تھا کہ آج بھی وہ شہری منصوبہ بندی کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے"

جے پور با اعتبار اپنے محل وقوع کے بھی خوش نصیب ہے کہ وہ راجستھان کے ایک شاداب خطے میں واقع ہے۔ سوائے جنوب کے شہر کے چاروں طرف خوشنما پہاڑیاں ہیں۔ جن پر جگہ جگہ قلعے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک۔ جس کو قلعہ نہار گڑھ کہتے ہیں۔ اور جو ۱۷۳۴ء میں بنا۔ شمال مغربی پہاڑی کی چوٹی پر اس طرح واقع ہے کہ گویا کسی نے شہر پر ایک نگہبان مقرر کر دیا ہے۔ یہ قلعے شہر کے قدرتی منظر میں خوبصورت اضافہ کرتے ہیں۔

شہر مستطیل نما بلاکوں میں، جنھیں جے پور کی اصطلاح میں "چوکڑیا" کہتے ہیں، آباد ہے۔ اور چوکڑیاں محلوں میں تقسیم ہیں۔ خاص خاص سڑکیں ایک سو دس فٹ چوڑی ہیں اور ہر سڑک ایک دوسرے سے اس انداز میں ملتی ہے کہ زاویہ قائمہ بن جائے۔ شہر کے چاروں طرف ایک کنگوروں دار پختہ فصیل ہے جو بیس فٹ اونچی اور نو فٹ چوڑی ہے۔ شہر پناہ میں سات دروازے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "سورج پول" اور دوسرے کا "چاند پول" ہے سورج پول اس مناسبت سے کہ والیان جے پور سورج بنسی تھے بڑا دروازہ نہایت بلند اور خوشنما ہے۔ مگر سب ہم شکل۔ چند سال قبل ایک نئے دروازے کا اضافہ ہوا جسے "مان پول" کہتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ موجودہ مہاراجہ کا نام سوائے مان سنگھ ہے۔ "مان پول" سوائے مان سنگھ ہائی وے پر رام نواس باغ کے سامنے واقع ہے۔

علاوہ شہر کی چوڑی چوڑی، خوشنما اور باقاعدہ بنی ہوئی سڑکوں کے جو چیز کسی سیاح کو سب سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے وہ ہے تمام دوکانات اور مکانات کی موزونیت اور ہم شکلی سڑک کے دو رویہ عمارتیں گویا ایک دوسرے کا جواب ہیں، اور اس پر یک رنگی سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔

تمام عمارتوں کا رنگ گلابی ہے۔ شروع میں سب عمارتوں کا رنگ سفید تھا۔ مہاراجہ سوائے رام سنگھ ثانی نے مختلف رنگوں کا تجربہ کیا اور بالآخر گلابی رنگ سارے شہر کے لئے پسند کیا۔ اس عدیم المثال ہم شکلی اور ہم رنگی نے بعض شخصوں کو جوش مسرت سے بے خود کر دیا ہے۔ انیسویں صدی کا مشہور فرانسیسی سیاح Pierre Loti پیئرلوٹی اپنی کتاب "انڈیا" میں لکھتا ہے:۔

"کیسا حیرت انگیز شاہی مسکن ہوگا جس نے گلابی رنگ کا ایک چولا پہنا ہے۔ پورا شہر بشمول الاجبال تمام مکانات، شہر پناہ، محلات، برج، بالاخانے اور مندر ایک رنگ کے ہیں، جن پر ہم شکل سفید پھولوں کی نقاشی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا در و دیوار پر ایک قیمتی پھولدار چھینٹ لگا دی گئی ہے یا پھر شہر کو گویا ایک سنگ سلیمان سے کاٹ کر بنایا ہے۔"

نہ صرف شہر کی عمارتیں، دروازے اور فصیل رنگین ہیں بلکہ بازاروں اور سڑکوں پر مرد اور عورت آپ کو طرح طرح کا رنگین لباس پہنے ہوئے ملیں گے۔ اور اگر آپ تیج یا گنگور کے تہوار کے موقع پر جے پور آئیں تو یقیناً آپ ایک دوسرے غیر ملکی سیاح کے اس قول سے اتفاق کریں گے کہ:۔

"جے پور ہندوستان کا سب سے زیادہ رنگین شہر ہے جہاں چہل پہل کی کمی نہیں۔ مردوں کے صافے اور پگڑیاں، انگرکھے اور اچکنیں رنگ برنگ اور مختلف وضع کی اور عورتوں کے دوپٹے اور لہنگے بھی عجیب انداز کے نظر آئیں گے۔ کسی کے دوپٹے میں چھوٹے چھوٹے آئینے لگے ہوئے ہوں گے جن کو دیکھ کر نظر خیرہ ہو کر رہ جائے گی۔"

جے پور کی ہر عمارت اپنی دلکشی کے علاوہ ایک تاریخ رکھتی ہے۔ اگر آپ بذریعہ ریل جے پور آئیں تو اسٹیشن سے چل کر چاند پول دروازہ سے شہر میں داخل ہوں گے۔ چاند پول بازار غلہ کی منڈی ہے۔ آگے بڑھ کر آپ کو ایک چوک ملے گا جسے "چھوٹی چوپڑ" کہتے ہیں۔ اس کے بعد بائیں ہاتھ کو ایک مینار نظر آئے گا جو "ایسر لاٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مینارہ مہاراجہ سوائے ایشوری سنگھ نے ۱۷۴۹ء میں تعمیر کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ مینارہ انہوں نے بطور یادگار فتح تعمیر کیا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ اس مینار پر چڑھ کر مہاراجہ خود اپنے شہر کو دیکھتے تھے اور اس کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔

اس سے آگے بڑھ کر بائیں جانب ہی ایک بلند دروازہ ہے یہ آتش کا دروازہ ہے۔ "آتش" ترکی کا لفظ ہے جس کے معنی گھوڑے کے ہیں۔ یہ شاہی اصطبل کا دروازہ ہے۔ اس سے تھوڑی ہی آگے محلات شاہی کا جنوبی دروازہ ہے جسے "ترپولیہ" کہتے ہیں اور جو اپنی خوشنمائی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ترپولیہ دروازہ سے کچھ آگے ترپولیہ بازار میں دائیں ہاتھ کو کتب خانہ عامہ کی عمارت ہے۔ یہ کتب خانہ ۱۸۶۶ء میں مہاراجہ سوائے رام سنگھ ثانی نے قائم کیا تھا۔ اسی کا قائم کردہ مدرسہ صنعت و حرفت کشن پول بازار میں ہے۔ مہاراجہ جے پور کا ذاتی کتب خانہ جسے پوتھی خانہ کہتے ہیں محلات شہر کے اندر ہے۔ پوتھی خانہ میں نایاب قلمی کتب اور روغنی تصاویر ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دو کا ذکر کروں۔ شہنشاہ اکبر کے نورتن میں کا ایک فرد ابو الفضل کا لکھا ہوا مہابھارت کا فارسی ترجمہ بہت ہی بیش قیمت ہے اور ایک لکھی "رزم نامہ" خوردبین سے دیکھنے کے لائق چیز ہے۔ اور ہندو مصوری کے شاہکار "راس منڈل" اور گیت گوبند وغیرہ بھی ہیں۔ ترپولیہ بازار کو طے کرنے پر ایک اور چوک آتا ہے جو "بڑی چوپڑ" یا "مانک چوک" کے نام سے مشہور ہے۔ اگر مجھ سے کوئی سوال کرے کہ "جے پور کا امتیازی نشان کیا ہے؟" تو میں بلا تامل کہوں گا "ہوا محل"۔ ہوا محل چوپڑ یا مانک چوک کے ایک طرف تقریباً شہر کے وسط میں واقع ہے۔ یہ گلابی پتھر کی عجیب و غریب پانچ منزلہ عمارت ہے جس کی تعمیر ۱۷۹۹ء میں شروع ہوئی اور ۱۸۰۰ء میں تکمیل کو پہنچی۔ ہوا محل کو دیکھ کر اکثر سیاح متحیر ہو جاتے ہیں۔ ایک انگریز نے اس کی نسبت لکھا ہے:۔

"ایک کشتی نما نادر وجود، خوبصورت گلابی پتھر کی عمارت جس میں رنگ نکلے ہوئے نازک نازک بالاخانے اور جالی دار دریچے پرواز کرتے ہوئے، قطار بر قطار، ایک انوکھی خیال عمارت خود علی شکل کی، ہوا دار، بے باک حسن کا پہاڑ ..."

ہوا محل سے ذرا آگے اسی طرف سوائے مان سنگھ ٹاؤن ہال کی بلند اور پر شکوہ عمارت ہے جو ۱۸۸۳ء میں تعمیر ہوئی اور جس میں اب راجستھان کی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس سے اور آگے محلات شہر کا صدر مشرقی دروازہ ہے جسے "سرہ ڈیوڑھی" کہتے ہیں۔ اس دروازہ کے اندر ایک بہت وسیع چوک المعروف "جلیب چوک" ہے جس کے چاروں طرف سرکاری دفاتر ہیں۔ واضح رہے کہ راجستھان سکریٹریٹ کی عالیشان عمارت جو پہلے "جلونت واس ہوٹل" تھی وہ شہر کے باہر ہے۔

محلات کے اندر داخل ہونے کے لئے کئی اور دروازے اور صحن طے کرنے پڑتے ہیں۔ اندر اول "دیوان عام" ہے جہاں مہاراجگان جے پور عام دربار منعقد کرتے تھے۔ اسی میں سے اکثر امرائے ہند مہاراجہ جے پور سے ملاقات بازدید کو آتے تھے اور ان کے اعزاز میں دربار منعقد ہوتا تھا جس میں تمام روساء، امراء اور افسران ریاست درباری لباس میں ملبوس شریک ہوتے تھے۔

دیوان عام سے آگے "سربتہ" یا "دیوان خاص" ہے۔ اس کے شمال میں "چندر محل" کی عظیم الشان سات منزلہ عمارت ہے جس کی چھت پر شرد پورنما کے موقع پر (چاند کی چودھویں شب ٹھیک اس وقت جب چاند کامل ہوتا ہے) شرد پورنما کا دربار ہوتا تھا۔ یہ دربار ایک انوکھی قسم کا ہوتا تھا۔ چاند کی روشنی میں سفید فرش پر اس اہتمام کے ساتھ کہ تمام درباریوں کا سفید لباس ہوتا تھا اور زیورات بھی سفید۔ اور خود مہاراجہ چاندی کے تخت پر بیٹھتے تھے۔ چندر محل کی تعمیر ۱۷۳۴ء میں ہوئی۔ چندر محل کے جنوب میں "مبارک محل" کی عمارت ہے جس کی پتھر کی جالیاں بہت مشہور ہیں۔

محلات شہر کا "جے نواس باغ" جس کو ۱۷۲۷ء میں ابتداً لگایا گیا تھا قابل دید ہے۔ چندر محل کے شمال میں گووند دیو کا مشہور مندر ہے جو ۱۷۳۵ء میں بنا۔ آگے چل کر "بادل محل" کی عمارت ہے جہاں تیج اور گنگور کے موقعوں پر دربار ہوتے تھے جس میں ایک روز سب درباریوں کا لباس سر سے پاؤں تک سبز ہوتا تھا اور دوسرے روز سرخ۔ بادل محل جے پور کا سب سے پرانا محل ہے۔

"بادل محل" سے آگے "تال کٹورا" ہے جس میں مگرمچھ تھے جو آواز دینے پر کنارے پر آ جاتے تھے۔

محلات میں علاوہ روغنی تصاویر اور قلمی کتب کے مہاراجہ صاحب کا سلاح خانہ ہے جس میں نادر اسلحہ ہیں اور ایک دیگر عمارت میں بیش قیمت اور لاثانی پشمینہ اور قالین ہیں۔

"مبارک محل" کے باہر بانی جے پور کی تعمیر کردہ رصد گاہ ہے جسے "جنتر منتر" کہتے ہیں۔ یہ اٹھارویں صدی عیسوی میں ۱۷۲۸ء اور ۱۷۳۴ء کے درمیان تعمیر ہوئی اور مہاراجہ سوائے جے سنگھ کی تعمیر کردہ پانچ رصد گاہوں میں سب سے بڑی ہے۔ باقی چار دہلی، بنارس، متھرا اور اجین میں بنائی گئی ہیں۔ اسی رصد گاہ میں مشہور مہاراجہ مذکور اپنے فلکیاتی ذوق کی تکمیل کرتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے پتھر کے آلات اب بھی موجود اور کارآمد ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

ہماری زبان

۸؍اکتوبر ۱۹۶۲ء

سردار کیروں سے ایک سوال

پنجاب کے بڑے وزیر سردار پرتاپ سنگھ کیروں نے قومی یکتا کے لئے کئی اچھی تجویزیں پیش کی ہیں۔ وہ پنجابی اور ہندی کی ترقی کے لئے مناسب قدم اُٹھا رہے ہیں۔ ملک کی دوسری زبانوں کی تعلیم کے لئے بھی اسکولوں میں انتظام کر رہے ہیں، سرحد کی زبانوں سے واقفیت کے لئے بھی تدبیریں سوچ رہے ہیں، مگر ابھی تک ہمیں یہ نہیں معلوم ہوا کہ پنجاب کی ایک اہم زبان اُردو کے لئے وہ کیا کر رہے ہیں؟

ہندی کے علاقے میں پنجابی کی مخالفت ہوتی ہے، پنجابی کے علاقے میں ہندی کی، مگر دونوں علاقوں کے رہنے والے اُردو جانتے ہیں، اُردو میں اپنے خیالات کی اشاعت کرتے ہیں اور اب بھی پنجاب کے دفتروں میں اُردو میں بڑی حد تک کارروائی ہوتی ہے۔ وہاں سے اُردو کے اخبار بڑی تعداد میں شایع ہوتے ہیں۔ جدید دور کے شاعروں اور ادیبوں میں سے کئی چوٹی کے لکھنے والے پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں، اُردو کے اچھے رسالوں اور کتابوں کی سب سے زیادہ کھپت اب بھی پنجاب میں ہوتی ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود پنجاب کی حکومت نے اُردو کی تعلیم اور ترقی کے لئے کوئی نمایاں قدم نہیں اُٹھایا۔ ویسے ہمدردی کے دعوے ہوتے رہتے ہیں، ضرورت ہے کہ ہر شہر میں کچھ ابتدائی اسکولوں، دو ایک ثانوی اسکولوں، ریاست کے کچھ کالجوں اور پنجاب یونیورسٹی اور پنجابی یونیورسٹی میں اُردو کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہو۔ پنجاب میں بڑی زندگی ہے، طاقت ہے، حُسن ہے۔ اس طاقت اور حُسن کو بڑھانے اور سنوارنے کے لئے اُردو بہت مفید ہو سکتی ہے، تعجب ہے کہ پنجاب کی حکومت اس سے پورا کام نہیں لیتی۔ بقول غالب

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

آہ ڈاکٹر زور

۲۵ ستمبر کو آل انڈیا ریڈیو کی ایک خبر سے معلوم ہوا کہ اُردو کے مشہور محقق، معلم اور ممتاز کارکن، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ۵۷ سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے سری نگر میں انتقال کر گئے۔

ڈاکٹر زور دو سال ہوئے چادر گھاٹ کالج حیدرآباد کی پرنسپل سے سبکدوش ہوئے تھے۔ کچھ دن کے بعد وہ جموں و کشمیر یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے شعبۂ اُردو کی سرگرمیوں کو تیز کیا، اور سری نگر کی ادبی فضا میں اور حرکت پیدا کی، حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں نہ صرف انھوں نے خود بہت سی کتابیں لکھیں، بلکہ نئے ادیبوں کی ہمت افزائی کرکے اُن کے کارناموں کو بھی منظرِ عام پر لائے۔ انھوں نے دکنی ادب کے متعلق تحقیق و تدقیق کا ایک قابل قدر ذخیرہ پیش کیا، دکن کے مشاہیر کے کلام کو ایڈٹ کرکے عوام کے سامنے لائے، لسانیات پر جدید اصولوں کی روشنی میں سب سے پہلے کتابیں لکھیں، ادارۂ ادبیات اُردو کے نام سے ایک شاندار ادبی ادارہ قائم کیا جس کی آج اپنی ایک شاندار عمارت ہے اور جس میں مخطوطات، مطبوعات، خطوط، رسائل اور دوسرے نوادر کا ایک یادگار ذخیرہ ہے۔ اپنے شاگردوں اور رفیقوں کو تصنیف و تالیف کا ایسا شوق دلایا کہ لکھنے والوں کی ایک جماعت تیار ہو گئی۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے نام پر ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کی یاد میں ایسے جلسے کئے کہ اب ان کی حیثیت ایک قومی میلے کی ہو گئی ہے۔

طالب علمی کے زمانے سے انھوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا جو آخر عمر تک جاری رہا، اُن کی اپنی تصانیف کی تعداد پچاس سے کم نہ ہو گی اور جو کتابیں اُنھوں نے شایع کرائی ہیں اُن کی تعداد تو بہت زیادہ ہے اُن کے بڑے کارناموں میں ہندوستانی لسانیات، ہندوستانی صوتیات، کلیات محمد قلی قطب شاہ، اُردو شہ پارے، تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اُردو (پانچ جلدوں میں)، روح تنقید، اُردو کے اسالیب بیان، داستان حیدرآباد، اُن کے ایسے کارنامے ہیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر زور نے اپنی ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزاری، اس کے ساتھ انھوں نے بڑے بڑے عملی کام بھی کئے۔ اُنھوں نے ادارۂ ادبیات اُردو جیسے شاندار ادارے کو ایسے زمانے میں ترقی دی جب حالات خاصے صبر آزما تھے، اُن کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمت و جرأت سے کام لیا جائے تو حالات ہمیشہ سازگار ہو جاتے ہیں، اور ہر کوہ کن کسی نہ کسی بے ستوں سے جوئے شیر نکال سکتا ہے۔

کُل ہند اُردو کانفرنس جے پور

کُل ہند اُردو کانفرنس کے سلسلے میں ایک خصوصی میٹنگ

جے پور۔ ۲ر اکتوبر ۶۲ء۔ آج ایک خصوصی میٹنگ بردولت کدہ جناب خان بہادر الطاف احمد صاحب خیری ۹ بجے صبح منعقد ہوئی میٹنگ مذکور میں ۳۰ر ستمبر کے جلسۂ عام کی روشنی میں تمام معاملات پر گہری نظر سے پھر غور کیا گیا اور اب تک ہونے والے کام کو اطمینان بخش پایا، لیکن پھر بھی یہ قرار پایا کہ کام کی رفتار کو مزید تیز کرنے کی ضرورت ہے۔

جن حضرات نے خصوصی طور پر اس میٹنگ میں شرکت فرمائی اُن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:۔

۱۔ جناب الحاج خان بہادر الطاف احمد صاحب خیری صدر انجمن ترقی اُردو راجستھان و خازن کل ہند اُردو کانفرنس جے پور۔

۲۔ جناب راؤ بہادر پنڈت اوتار نارائن صاحب بہادر سابق کلکٹر راجستھان و منتظم اعلیٰ کل ہند اردو کانفرنس جے پور۔

۳۔ جناب افتخار علی صاحب شمیم سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ سینٹرل پریس جے پور و سکریٹری مشاعرہ کمیٹی۔

۴۔ جناب مولوی احترام الدین احمد صاحب شاغل عثمانی، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو راجستھان۔

کُل ہند اُردو کانفرنس کے سلسلے میں ایک عام میٹنگ

۳۰ر ستمبر ۶۲ء بوقت چار بجے شام بمقام اُردو ہال مسلم مسافر خانہ جے پور ایک عام میٹنگ کل ہند اُردو کانفرنس کے سلسلے میں منعقد ہوئی، جس میں بلا تفریق مذہب و ملت ہر مکتب خیال کے اصحاب نے شرکت فرمائی، جس کے باعث اُردو ہال کی وسعت شرکاء کی کثرت سے تنگ نظر آ رہی تھی۔ میٹنگ کی صدارت الحاج خان بہادر الطاف احمد صاحب خیری نے فرمائی، سب سے پہلے گذشتہ میٹنگ منعقدہ ۲۶ر اگست ۶۲ء کی روداد جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو راجستھان کی جانب سے جناب خدا داد خاں صاحب مونس اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اُردو راجستھان نے پڑھ کر سنائی، اس کے بعد کانفرنس کے سلسلے میں مجوزہ کمیٹیوں کے صدر اور سکریٹری صاحبان نے حاضرین کو اپنے متعلقہ کام کی پیش رفت سے مطلع کیا، جس پر اظہار اطمینان کیا گیا۔

آخر میں، راجستھان سے شریک ہونے والے پانچ ڈیلی گیٹ حضرات کا انتخاب کیا گیا اور باتفاق رائے مندرجہ ذیل اصحاب منتخب ہوئے۔

(۱) جناب پنڈت دامودر لال صاحب ویاس سابق ڈپٹی منسٹر گورنمنٹ آف راجستھان و صدر مالیاتی کمیٹی کل ہند اُردو کانفرنس جے پور۔

(۲) جناب پنڈت راؤ بہادر اوتار نارائن صاحب بہادر ریٹائرڈ کلکٹر راجستھان و منتظم اعلیٰ کل ہند اُردو کانفرنس جے پور۔

(۳) جناب سید احمد علی شاہ صاحب قمر جعفری، آئی اے ایس، ریٹائرڈ کمشنر راجستھان و صدر مشاعرہ کمیٹی۔

(۴) جناب مولوی احترام الدین احمد صاحب شاغل جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو راجستھان۔

(۵) جناب افتخار علی صاحب شمیم سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ سنٹرل پریس راجستھان و سکریٹری مشاعرہ کمیٹی۔

اس کے بعد شکریہ کے ساتھ میٹنگ برخاست ہوئی۔

کلیم الدین تجلی عثمانی
اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اُردو راجستھان

علمی و ادبی نمائش کتب

کل ہند اُردو کانفرنس کے سلسلے میں جو نمائش جے پور میں ہونے والی ہے اس میں مطبوعات اُردو ۶۰، ۶۱، ۶۲ء کے علاوہ راجستھان کے نادر مخطوطات، نایاب مسودات، خطاطی کے بہترین نمونے، تاریخی فرامین شاہی اور دیگر نوادر کا بھی ایک حصہ ہوگا۔ اس کا تمام انتظام پروفیسر سید بشیر الدین سابق لائبریرین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، حال لائبریرین راجستھان یونیورسٹی نے اپنے ذمے لیا ہے، اور جے پور کی مہارانی گیاتری دیوی ممبر پارلیمنٹ نے اس کا افتتاح کرنا منظور کر لیا ہے۔ راجستھان کے گوشے گوشے سے نوادر جمع کئے جا رہے ہیں۔ (سکریٹری نشر و اشاعت)

ضروری گزارش

براہِ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر "جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ" کے پتے پر فرمایئے۔ بعض خطوں پر منصب کی بجائے نام لکھا ہوتا ہے ایسے خطوں کی تعمیل میں مختلف وجوہ سے دیر ہو جاتی ہے۔ جس کے نام خط لکھا گیا ہے اگر وہ کارکن چھٹی پر ہو، بیمار ہو، دورے میں ہو یا عدم موجودگی کی کوئی اور صورت ہو تو وہ ڈاک کھلتی نہیں اور اہم خطوط کا جواب بروقت نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے خط "جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند)، علی گڑھ" کے پتے پر بھیجئے۔ شکریہ

حصۂ نظم

ایم کوٹھیاوی راحی

تیرے سوا

پیار کی مجھ کو
بھیک ملی تھی
شہرِ وفا میں
لیکن میں اک پردیسی تھا
شہرِ وفا کے باشندوں سے
ناواقف تھا
چھین لیا اک دل والے نے
آج مرے دل کا کشکول!
بھیک تھی جس میں
پیار کی بھیک۔

آج کھنڈر میں
تاریکی ہے
سناٹا ہے
دم گھٹتا ہے
سوچ سوچ کر
"اب کیا ہوگا
اب کیسے بدلے گا میرا
یہ افسردہ سا ماحول"؟
موت ہے جس میں
سوچ کی موت!

کیا جاؤں اب
شہرِ وفا میں
کون ہے اپنا
کون سنے گا
دھیان لگا کر
میرا غم!؟

آنکھیں سوکھ چکی ہیں اب تو
روتے روتے
ماں تو اپنی آنکھیں کھول!
نور ہے جس میں
پیار کا نور!

شہاب شمسی

آرزوئے ناکام

اک زمانہ ہوا تم کو دیکھا تھا
تم سے چاہا تھا دل کی بات کہیں
دردِ سوزِ نہاں کہیں تم سے
چشمِ گریاں کی تم سے بات کریں

سازِ ماضی پہ یادِ رفتہ کا
کوئی غم ناک آتشیں نغمہ
خلوتِ شب میں چھیڑ کر اے دوست
قلبِ محزوں کو اپنے شاد کریں

کشتۂ ہجر کی سیہ بختی
باتِ دل کی زباں پہ جب آئی
ہائے افسوس! نیند ٹوٹ گئی

غزلیں

شاہین غازی پوری

جھلکی جھلکی سی یہ آنکھیں یہ دل کے ویرانے
تراش لے گا زمانہ اسی کے افسانے

جنونِ شوق کا انجام دیکھئے کیا ہو
چلے ہیں لوگ مرے دل کو آج سمجھانے

پکارتا ہوا ہر رہ گذر پہ نام ترا
پہنچ گیا ہوں کہاں سے کہاں خدا جانے

سنا ہے تھا کوئی شاہین نام کا شاعر
کہ جس کی یاد میں رویا کئے صنم خانے

قیس رامپوری

مزاجِ تشنگی پہچانتا ہے
وہ ساقی جو لبوں سے آشنا ہے

یہ سچ ہے ہر قدم پر غم ملا ہے
مگر یہ زیست پھر بھی دلربا ہے

خود اپنے سائے پر شک تھا اجل کا
کچھ اس انداز سے جینا پڑا ہے

جنوں میں قیس ہم پہنچے جہاں بھی
شعورِ رہبر ساتھ اپنے رہا ہے

فراز حامدی

کیا دیکھے گا کوئی انھیں ہم دیکھ رہے ہیں
اک حشر سراپا بہ قدم دیکھ رہے ہیں

اربابِ خرد دیر و حرم دیکھ رہے ہیں
دیوانے ترا نقشِ قدم دیکھ رہے ہیں

جن آنکھوں میں رقصاں تھی تبسم کی بہا کا
ہم آج ان آنکھوں کو بھی نم دیکھ رہے ہیں

گمراہ ہوئے جاتے ہیں یہ کیسا ستم ہے
حالانکہ ترا نقشِ قدم دیکھ رہے ہیں

محمد حسن خاں قیس

مختصر قصۂ حیات کرو
دشتِ تشنہ کی کوئی بات کرو

بھول جاؤ خوشی کوئی شئے ہے
سہل دشواریٔ حیات کرو

توڑ کر پھینک دو یہ زنجیریں
کچھ تو فرزانگی کی بات کرو

جو نہیں تو مہرِ حبیب بھی ہو جو
شام کو صبح کی نہ بات کرو

مراسلات

وقار خلیل کی نظم "یادیں"

۲۲ر ستمبر کا "ہماری زبان" کل ملا۔ اس کے شعری حصے میں وقار خلیل صاحب کی نظم "یادیں" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس کی پہلی تین سطریں یوں ہیں:۔

"اک ان جانے کھوئے کھوئے پاگل زلفوں والے نے
ہم کو تم کو دیکھ لیا
کام و دہن سے اُس لڑکے نے خوشبوں کی پچکاری چھوڑی... الخ

مجھے اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ ۲۹ر اگست ۱۹۶۲ء کو یعنی صرف ایک ماہ پہلے میری ایک نظم "بخشش" کے عنوان سے حیدرآباد کے روزنامے "سیاست" میں شائع ہوئی تھی۔ وہ نظم یوں شروع ہوتی ہے:۔

"کالی گھنگھرالی زلفوں والے بالک نے،
حیران پریشان
کھوئے کھوئے
ہم کو تم کو دیکھ لیا
اور اچانک انجانی پاگل خوشبوں کی پچکاری ماری
خوشبو، عطروں، رنگوں سے ہم بھیگ گئے... الخ

اگر دونوں نظمیں پڑھی جائیں تو اور بھی کئی تشبیہیں اور استعارے ملیں گے، جو مشترک ہیں۔ لیکن ہماری نظموں کے موضوع میں کافی اختلاف ہے مثلاً وقار خلیل صاحب کو "اس لڑکے" کی یاد ستا رہی ہے، میری نظم میں "بالک" کام دیو، یا کیوپڈ کی علامت ہے، اور کسی گزشتہ محبت کی کیفیت کا بیان ہے۔

بہرحال یہ ظاہر ہے کہ وقار خلیل صاحب میری نظم سے کافی متاثر ہوئے ہیں، اور وہ انھیں پسند آئی ہے۔ اس کے لئے میں ان کا شکرگزار ہوں۔ لیکن شاید اتنا زیادہ متاثر ہونا، وقار خلیل صاحب کے شایان شان نہیں ہے۔

(سجاد ظہیر)

نحوی اور لغوی تحقیق

"ہماری زبان" مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۶۲ء میں ایک مراسلہ محمد زکریا صاحب (کراچی) کا شائع ہوا ہے جو میرے مضمون "اردو لغت" (مندرجہ ہماری زبان، ۲۲ر جون ۱۹۶۲ء) کے جواب میں لکھا گیا ہے، اس مراسلے میں صریحاً میری تنقید کی تغلیط ہی نہیں بلکہ ضمناً ائمۂ ادب کی اصول پر اندازی کی بھی کوشش کی گئی ہے، اس لئے لازم ہوا کہ اس کا جواب مسکت موصوف تک پہنچاؤں اور ان مضامین پر سیر حاصل بحث کسی ادبی مجلے میں پیش کروں،

اصل یہ ہے کہ ترقی اُردو بورڈ کراچی کے سہ ماہی مجلہ "اردو نامہ" (شمارہ ہفتم و ہشتم جنوری تا جون ۱۹۶۲ء) شعبۂ لغت کراچی کی جانب سے جو لغاتچہ شائع ہوا تھا اس پر اس خاکسار نے ایک مختصر سی تنقید "ہماری زبان" کے حوالے کی تھی، جس کا جواب اگرچہ پونے تین مہینے بعد محقق موصوف نے دیا ہے لیکن افسوس اس امر کا رہا کہ اس میں "دیا یہ درست آیہ" کی جھلک تک نہیں، جیسا کہ عن قریب اہلِ نظر پر روشن ہو جائے گا،

(اُردو نامہ کے صفحہ ۳۲ پر) اباطیل جمع مذکر (تنقید) واحد بھی بیان کرنا چاہیے یعنی ابطولہ، ابطالہ (جس طرح ابابیل کا واحد صفحہ ۲۳ پر درج کیا ہے)

جواب۔ ابطولہ یا ابطالہ عربی زبان کے مستعمل لفظ نہیں، اباطیل کا واحد باطل ہے، وشذ فاعیل فی نحو فلن کرہطا ورا جل کباطل (شرح الاصول الاکبریہ)

جواب الجواب۔ آپ نے اصل اعتراض کو تو قبول نہ فرمایا یعنی اُس واحد کا اضافہ نہ کیا (جس سے اُردو نامہ خالی ہے) بلکہ الٹا گئے اور میری تحریر پر اعتراض کر دیا، خاکسار نے بین القوسین "جس طرح ابابیل کا واحد" ان الفاظ میں اس جانب بھی اشارہ کیا تھا کہ انھی اوزان پر جو ابابیل کے واحد کے ہیں، اباطیل کے واحد بھی آتے ہیں، اور ان میں سے ابطولہ، ابطالہ کو بیان بھی کر دیا تھا،

استقرا و استقصا سے معلوم ہوا ہے کہ جس طرح اغلوطہ کی جمع اغالیط، اضحوکہ کی اضاحیک، اکذوبہ کی اکاذیب، اسطارۃ اور اسطورہ کی اساطیر ہے، اسی طرح ابطالہ اور ابطولہ کی اباطیل اور ابّول کی ابابیل ہے، ابابیل کا واحد کسائی کے نزدیک ابّول، فراء کے نزدیک ایبالہ، ابوجعفر کے نزدیک اِبّالہ اور اخفش کے نزدیک یہ جمع لاواحد لہ ہے، قاموس اور الزھر میں ابیل بھی درج ہے، اسی طرح اباطیل کا واحد جہاں باطل ہے وہاں قیاسی طور پر ابطیل، ابطولہ، ابطالہ بھی ہے، ابطیل کو صحاح میں جوہری نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے "کانھم جمعوا ابطیلا" اور ابطولہ، ابطالہ تو قاموس میں بھی موجود ہیں۔ اب ان الفاظ کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھ لیجئے۔

ابیل ۔ ابطیل ابّول (= ابولہ) ابطولہ اِبّالہ (ایبالہ) ابطالہ	ابابیل، اباطیل

ہاں آپ کا یہ فرمانا کہ ابطولہ، ابطالہ عربی زبان کے مستعمل لفظ نہیں، عجیب و غریب ہے، کراچی کے مدینہ یا بنارس کے مصر میں یہ الفاظ مستعمل نہ ہوں، نہ سہی، عرب عربا اور فصحائے عرب کے روزمرہ میں تو داخل ہیں، چنانچہ مجدالدین فیروز آبادی قاموس جلد ثالث مطبوعۂ مصر کے صفحہ ۳۳۳ پر فرماتے ہیں وجمعہ الابطولۃ بالضم والابطالۃ بالکسر باطل۔ آپ کی پیش کردہ عبارت وشذ افاعیل میں ان الفاظ کی جمع شاذ یعنی غیر قیاسی کا وزن بتایا گیا ہے اور میں نے ان مفردات کا سراغ لگایا ہے جن کی جمع بننے کا قیاسی طور پر اباطیل کو حق حاصل ہے، اس لئے دونوں میں کچھ تعارض نہیں،

(اُردو نامہ کے صفحہ ۳۴ پر) ابتث اسم مذکر (تنقید) ابتث مونث ہے ابجد کی طرح (صفحہ ۳۳ ملاحظہ ہو)۔ (جواب) مراسلہ نگار ابتث کو ابجد پر قیاس کرکے مونث بتاتے ہیں حالانکہ دونوں میں فرق ہے ابتث حروف کے ساتھ (حروف ابتث) مستعمل ہے اور حروف مذکر ہیں۔ ابجد اکثر تنہا استعمال ہوتا ہے، ابجد سے پہلے لفظ حروف ہو تو وہ بھی مذکر ہوگا۔ مثلاً اس نے حروف ابجد اپنے ہاتھ سے لکھے۔

(جواب الجواب) آپ کی اس ضد کی کیا انتہا ہے؟ کیوں صاحب

بقول آپکے جب ابتث حروف کے ساتھ مستعمل ہے تو تذکیر حروف کی ہوئی یا ابتث کی (مثلاً حروف ابتث پڑھے) اور جب بقول آپکے حروف مذکر ہیں تو ابتث کا شمار کس مد میں ہوگا، مذکر یا مؤنث، پھر اس صورت میں اسے مذکر کس دلیل سے قرار دیا، آپ کی مثال میں نہ تو وہ مذکر ہے نہ مؤنث، جو کچھ ہے وہ حروف، اچھا اب کوئی تیسری جنس اختراع فرمایئے بہر حال تذکیر تو ثابت نہ ہوئی۔

فرق بھی آپ نے خوب بیان فرمایا اور سچ تو یہ ہے کہ ایجاد فرمایا کہ ابجد اکثر تنہا اور ابتث حروف کے ساتھ، یہ حروف کی قید بھی قید احترازی ہے یا قید فرنگ ہے، (تنو "کہنا تو بے ادبی ہے) اگر کوئی کہے کہ "یہ حروف ترتیب ابتث کے مطابق لکھے گئے ہیں اور وہ حروف ترتیب ابجد کے موافق" تو آپ کی مثال کا حشر کیا ہوگا، اور جب بقول آپکے ابجد سے پہلے لفظ حروف ہو تو وہ بھی مذکر ہوگا (اور بقول آپکے ابتث حروف کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے اور غالباً اسی سائنٹفک اصول پر آپکے اسے لغت میں مذکر قرار دیا ہے) تو اب تو دونوں ایک ہو گئے۔ فرق کہاں رہا، اس کو مذکر کہیے تو اس کو بھی، اس کو مؤنث کہیے تو اس کو بھی،

پھر یہ جو ارشاد ہے کہ وہ بھی مذکر ہوگا اس وہ کا مرجع کیا ہے، حروف یا ابجد، حروف تو ہو نہیں سکتا اس لئے کہ ہوگا، فعل واحد ہے اور بھی کی معنویت شرکت ہے، لہٰذا ابجد کو مذکر قرار دیا اور یہ ظاہر ہے۔ ماشاءاللہ آپ کو مونث کا مذکر بنانا بھی خوب آتا ہے، لیکن خدا کے واسطے کسی مذکر کو مؤنث نہ بنوایئے ورنہ کوئی آپ ہی سے سبق لے کر آپ کے مذکر ابتث کو مؤنث بنا دیگا، اس فقرے کو ملاحظہ فرمایئے اور پڑھیئے۔

"ہندی بچوں کے لئے حروف کی تعلیم میں ترتیب ابتث ہی ملحوظ رکھی جاتی ہے" کیا انقلاب جنسیت ہوگیا، نہیں، قواعد کی خورد بین بتاتی ہے کہ یہاں بھی دھوکا ہے، ترتیب کی تانیث کی وجہ سے فعل مؤنث آیا، ابتث کی تذکیر و تانیث سے یہ فقرہ ساکت رہا، جس طرح آپ کے مذکورۂ بالا دونوں فقرے" ابجد اور ابتث" کی تذکیر و تانیث سے ساکت ہیں۔

اب ذرا اپنی لغت میں یہ سند بھی مطالعہ فرما لیجئے ؎

دفتر منقبت شاہِ نجف کھولتا ہوں
لو میں ابتث سے بھی اب حد کے شرف کھولتا ہوں

اس "ابتث" میں نہ تو ترکیب اضافی یا توصیفی کی ہتکڑی ہے اور نہ آپ کے "حروف" کی بیڑی، لہٰذا من مانی قید جو آپ نے ابتث کے حق میں لگائی تھی وہ تو بحمد و تعالیٰ ٹوٹ گئی البتہ اس سند میں یہ خامی اور نکل آئی کہ "تذکیر و تانیث" سے عاری ہے، ہاں! اس کے ذمہ دار آپ بھی ہیں ؎

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

اب میں اتمام حجت کے طور پر یہ دریافت کرتا ہوں، کہ (۱) میں نے تختی پر الف بے تے ثے لکھی یا ابتث لکھی،

(۲) میں نے تختی پر الف بے تے ثے لکھا یا ابتث لکھا، ان دونوں فقروں میں سے کونسا آپ کے منہ لگا ہوا ہے، "جسے چاہے پیا وہی سہاگن" جو آپ کی پسند ہو وہی قول فیصل ؎

زباں ہلاؤ تو ہو جائے فیصلہ دل کا
اب آ گیا ہے لبوں پر معاملہ دل کا،

اس موقع پر حرم لغت کے نازنین ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنے لب جاں بخش سے اور کچھ نہیں تو ایک اور محض ایک "مرحبائے دل نواز یا جزاک اے جاں فزا" مرحمت فرمائیں تو میں سمجھوں کہ سب کچھ پھر پایا ورنہ اُن کا ایک سکوت اور وہ بھی سکوت ناز مجھ جیسے جاں بلب کو اور تڑپا تا رہے گا،

(اُردو نامہ کے صفحہ ۳۱ پر) ابدال جمع واحد بدیل (تنقید) واحد بیان کیا، اچھا کیا، اور یہ لکھتے تو اور اچھا ہوتا کہ "ابدال" اردو میں بطور واحد مستعمل ہے۔

جواب - مراسلہ نگار کا مشورہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں اس لئے کہ "ابدال" اردو میں عموماً بطور جمع مستعمل ہے۔

سب سے بڑھ کر ہے انھی کو دشمنی اسلام سے
آج ہے جن کا شمار اقطاب اور ابدال میں

(ظفر علی خاں، بہارستان، ۶۴۶)

(جواب الجواب) اچھا صاحب، آپ میری بات کسی طرح بھی نہ مانئے، میرا مشورہ، لجاجت، نرمی ملاحظہ فرمائیے اور اپنی ضد، درشتی اور خوش خلقی، پھر میرا یہ فقرہ کہ "ابدال" اُردو میں بطور واحد مستعمل ہے، قضیۂ موجبہ جزئیہ کے حکم میں ہے (جیسا کہ علوم نظری پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں) اور آپ کا یہ حکم کہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں، قضیۂ سالبہ کلیہ ہے، اور ان دونوں میں مغایرت تامہ اور مباینت کاملہ ہے۔ کیوں نہ ہو بہت اچھا! حکم حاکم مرگ مفاجات،

بارے یہ خاکسار اب ثابت کرتا ہے کہ کسی طرح بھی "ہے" یا کسی طرح بھی "نہیں"؟ و باللہ التوفیق،

پہلا مقدمہ) حقیقت یہ ہے کہ بعض عربی الفاظ جو فی الاصل جمع ہیں اردو میں بطور واحد مستعمل ہیں، مثلاً حور، اولاد، تحقیقات، کرامات، اولیا، ہم نے ایک حور دیکھی، زید کی ایک ہی اولاد ہے، تحقیقات ہو رہی ہے، تم نے اس کی کرامات دیکھی، زید بھی ایک اولیا ہے، اور یہ بالاتفاق درست ہے،

دوسرا مقدمہ) اب بعض وقت تعظیم کے طور پر واحد کو بطور جمع کے استعمال کرتے ہیں، مثلاً والد صاحب تشریف لائے، ہمارے محلے میں ایک اولیاء رہتے ہیں اور یہ بھی ہر طرح جائز و صحیح،

تیسرا مقدمہ) ابدال کا بھی یہی حال ہے، جمع تعظیمی بھی اور واحد بھی، مثلاً زید ایک ابدال ہے، ہم نے ایک ابدال سے علی الاعلان کی کرامات کا مشاہدہ کیا، جب کسی مقام پر ایک ابدال فوت ہو جاتا ہے (یا کسی ابدال کا وصال ہو جاتا ہے) تو انتظام باطنی کے ماتحت دوسرا ابدال اس کے منصب پر فائز المرام ہوتا ہے۔

فقرات مذکورۂ بالا تمام ٹکسالی ہیں (صحیح و فصیح ہیں) اور

'ابدال' کی وحدت پر بے لاگ گواہی دے رہے ہیں، ابدال کا ایک سے معدود ہونا، ابدال کے لئے 'ہے' کا درست ہونا، 'فوت ہو جاتا ہے' کا فاعل ہونا، "کسی" سے موصوف ہونا، دوسرا کے سے معدود ہونا ضمیر "اس" کا مرجع بننا، "ہوتا ہے" کا مبتدا بننا، یہ تمام دلائل قوی ہیں اس امر کے کہ ابدال "واحد" ہے ورنہ یہ تمام فقرے غلط اور غلط در غلط، اور اگر صحیح تو آپ کا دعویٰ بے بنیاد، بے اصل، بے سند،

ہاں جب یہ کہتے ہیں کہ تمام عالم میں چالیس ابدال رہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اُردو قواعد کے مطابق جس طرح 'مرد' کی جمع 'مرد' اور انسان کی انسان رہتی ہے (مثلاً بیس مرد آئے، دو انسان ملے) اسی طرح ابدال کی جمع بھی ابدال ہی رہے گی، اسی طرح جمع تعظیمی میں بھی اس کے لئے ضمائر اور افعال صیغۂ جمع ہی آئیں گے،

محقق موصوف نے سند جو پیش فرمائی ہے اور اس سے جو شک پیدا ہوا ہے اُسے بھی دفع اور رفع کئے دیتا ہوں سُنئے یہاں مضاف محذوف ہے یعنی زمرۂ اقطاب اور گروہ ابدال۔

اور یہ تعین مضاف اصولاً بھی نہایت صحیح ہے کیونکہ ارباب لغت لکھتے ہیں کہ ابدال نام ہے ایک گروہ کا۔۔۔ لہٰذا اضافت توضیحی ہو گئی، اور لفظ گروہ بھی میرے دعوی کی تائید کرتا ہے، کیونکہ اس صورت میں بھی وحدت کا اطلاق اولیٰ رہا۔ لیکن اب بھی ؎

وہ نہ مانیں گے نہ مانیں گے ہماری بات کو،

مانتے ہیں ہم اسے، یہ بات ہے مانی ہوئی

(اُردو نامہ کے صلا پر) ابابیل اَبالہ یا ابیل کی جمع،

(تنقید) ابول بھی لکھنا چاہئے اور جس طرح "اب وجد" کے تحت میں یہ نوٹ درج ہے کہ اُردو اور فارسی میں "جد" کی دال مخفف ہے یہاں بھی بصیرت کے واسطے یہ لکھنا چاہئے کہ اگرچہ ابابیل جمع ہے لیکن اُردو میں بطور واحد مستعمل ہے۔

جواب۔ ابابیل کی تشریح کے بعد اس کی ضرورت نہیں کہ یہ لکھا جائے کہ ابابیل اردو میں واحد ہے۔ مرتبین لغت نے "ابول" ابابیل کا واحد شاید اس لئے نہیں لکھا کہ وہ مرجوح ہے۔

جواب الجواب۔ ماشاء اللہ، چشم بد دور کیا معقول جواب ہے۔ ؎

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو

یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

لغت میں ابابیل کی تشریح کا خلاصہ تو یہی ہے کہ ایک پرند ہے (یا جن لغوت پر بہت لکھ دیا ہے ؟ !!)

تو مہربان میرے اس تشریح سے وحدت و جمعیت کی توضیح کا جز کیونکر ساقط ہو گیا، بعض الفاظ ہیں کہ واحد ہوتے ہوئے بھی بطور جمع مستعمل ہیں مثلاً مجھیں، درشن، گیہوں، اور بعض جمع ہو کر ہوتے ہوئے بھی بطور واحد مستعمل ہیں، مثلاً اولاد، حاضرات، کرامات، جوہر، اب تا وقتیکہ ابابیل کے لئے یہ نہ بتایا جائے کہ وہ واحد کے طور پر مستعمل ہے یا جمع کے طور پر، ایک اجنبی شخص کیا سمجھ سکتا ہے؟ بادی النظر میں یہی کہ جمع مستعمل ہونا چاہئے کیونکہ وہ جمع ہے، افسوس ہے کہ حضرات شعبۂ لغت کا تقاضا ہے کہ مشورہ! مشورہ! اور آپ ان کی نا جائز حمایت میں اُلٹی سیدھی باتیں کر کے زبان بند کئے دیتے ہیں،

جب علمی کاموں میں یہ نفسانیت اور خود پسندی قائم رہے گی تو کامیابی معلوم! ہاں ذرا ایک دفعہ پھر فرما دیجئے کہ اس کی ضرورت نہیں، کیا آپ بھی نہیں جیسی جد کی دال کی تخفیف کا بیان (حالانکہ اُسے عموماً مخفف ہی بولیں گے خواہ فارسی ہوں یا عامی) اور کیا اتنی بھی نہیں جیسی "ابیل کی جمع" اَبالہ کی جمع" (حالانکہ یہ واحد نہ لکھنؤ میں بولے جاتے ہیں نہ دلّی میں) آپ فیڈل، دیر یا میں کسی کے لوگ زبان ہو تو میں کچھ نہیں سکتا) یا یہ بات کہ ؎ بات پر واں زبان کٹتی ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اب جواب کا دوسرا جزو ملاحظہ فرمائیں، "ابول شاید اس لئے نہیں لکھا کہ وہ مرجوح ہے" یہ شاید آپ کی قسم کھانے کے لائق ہے، اسے حُسن تعلیل کہوں یا تعلیل حُسن، مرجوح ہونے کا علم جناب کو لکھنو کو دی (سنسکرت ویاکرن کی کتاب) یا ویبسٹر ڈکشنری سے ہوا؟! افسوس ہے کہ جو حضرات ابجد کی تذکیر کی دلیل یہ پیش کریں کہ حروف ابجد میں حروف مذکر، وہ محض اپنی اور اپنے رفقائے کار کی ناجائز حمایت کے لئے ابول کو مرجوح قرار دیں، کیا کہنا اس حسن لیاقت کا! قیامت ہے! غضب ہے۔ ملاحظہ ہو: تفسیر کبیر جلد رابع مطبوعہ مصر کے صفحہ ۴۸۴ پر امام محمد فخر الدین رازی فرماتے ہیں:۔

قال الکسائی کنت اسمع من النحویین یقولون ابول و ابابیل کعجول و عجاجیل۔

اب مطلب سمجھ لیجئے، کسائی کا قول ہے کہ میں نے ارباب نحو کو یہ کہتے ہوئے بارہا سُنا ہے کہ ابول و ابابیل (واحد و جمع ہیں) جس طرح عجول و عجاجیل (اسی وزن پر)

جناب والا! راوی و ناقل اس کے امام رازی، قائل کسائی جیسا بلند پایہ نحوی، کنت اسمع کا استمرار اس کے فصیح صحیح بلکہ اصح ہونے پر دلالت، پھر یہ سماعت ایسے ویسوں سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے جن کے بارے میں کہا ہے : ؎

نحویاں را مغز باید چوں شہاں، اور وہ بھی ایک دو نہیں بلکہ جوق جوق چنانچہ ال کا جمع پر داخل ہونا اس معنی کا افادہ کر رہا ہے،" اب آپ کی شان میں کیا عرض کروں بجز اس کے کہ ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کسائی کو جو نحو کا "مرغ قبلہ نما" ہے اگر آپ کے تیر تغافل نے سات سمندر پار آشیانۂ قبر میں تڑپا دیا تو کراچی کی بندرگاہ میں بیٹھے بیٹھے بے چارے مصطفیٰ کو علی گڑھ میں گھائل کرنا کونسی بڑی بات ہوئی، اللھم زد فزد۔

اس خیال سے کہ کہیں مضمون کی طوالت کسی کی نزاکت پر بار نہ ہو جائے اسی پر اکتفا کرتا ہوں، مصدر کی اہمیت اور فعلیت اور "اب" کا "آب کے" کی اضافت اور صفت پر بحث آئندہ قسط میں پیش کروں گا، واللہ الموفق والمعین۔

خاک پائے اہل صفا مصطفیٰ

چھتاری کمپاؤنڈ، علی گڑھ

ڈاکٹر زور کے انتقال پر تعزیتی جلسے

ادارۂ ادبیات اُردو، ابوالکلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ہندی پرچار سبھا۔

۲۹ر ستمبر۔ آندھرا پردیش کے تین بڑے علمی اور تہذیبی اداروں، ادارۂ ادبیات اُردو، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ہندی پرچار سبھا کی جانب سے آج شام ایوان اردو میں اس ایوان کے معمار اور ادارۂ ادبیات اُردو کے بانی اور روح رواں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ قاری عبدالباری کی قرأت سے اس پُر اثر جلسہ کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، اور نواب مہدی نواز جنگ گورنر گجرات کے تعزیتی پیامات پڑھ کر سنائے گئے۔ ایوان اُردو زور صاحب کے رفیقوں اور پرستاروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صدر ادارہ مسٹر سید علی اکبر نے کہا کہ ڈاکٹر زور کی شخصیت میں جاذبیت تھی۔ ادارۂ ادبیات کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اس ادارہ کو ہمیشہ سیاسیات سے دور رکھا۔ ہمارا فرض ہے کہ ادارہ کو قائم رکھیں اور ترقی دیں۔ مسٹر مخدوم محی الدین نے کہا کہ ڈاکٹر زور کی موت نہ صرف دکن بلکہ ساری دنیا کا عظیم ترین نقصان ہے۔ وہ میرے نہ صرف مشفق استاد تھے بلکہ بہت بڑے دوست رفیق اور ادبی معاملات میں رہنما رہے ہیں۔ ان کی شخصیت مُرجھائی ہوئی زندگی میں جان ڈالنے والی تھی اور ان کے وجود سے اُردو والوں میں تازگی اور زندگی پیدا ہوئی تھی وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے اور ان کی معصرانہ چشمک بھی ادبی اور علمی سطح پر ہوا کرتی تھی۔ آج کے حالات میں وہ یوم محمد قلی قطب شاہ اور ملی جُلی تہذیب کی عکاسی کرنے والے دکھنی ادب کی ترویج اور اشاعت کے ذریعہ قومی یکجہتی کے لئے گراں قدر خدمت انجام دے رہے تھے اس کام کو برقرار رکھنے اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ اس طرح ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے۔ علامہ حیرت بدایونی نے کہا "دکن کا کوہ نور کشمیر کی وادی میں کھو گیا اور تاریخ بنانے والا خود ایک تاریخ بن گیا۔" پروفیسر سید محمد نے کہا کہ ایوان اُردو کی ایک ایک اینٹ ان کی مرہون منت اور ان کے نفیس مذاق کی زندہ شہادت ہے۔ ڈاکٹر نظام الدین نے کہا کہ ایسی بہت کم شخصیتیں گذری ہیں جنھوں نے زندگی میں ہی اپنے بلند اور اعلیٰ مقاصد میں کامیابی حاصل کر لی ہو۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے کہا کہ حیدرآباد والوں کے لئے ایک سہارا جاتا رہا، ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتا مسٹر ایل۔ این۔ گپتا نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ تاریخی اور تحقیقی مواد کی فراہمی کا جو کام زور صاحب نے کیا ہے اس سے آئندہ نسلیں استفادہ کریں گے اُردو اور اس کے ادب کو مالامال کر سکتی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اُردو کو نئی زندگی ملی تھی اور حیدرآباد میں جدید ثقافتی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ اس نئی فضا کو پیدا کرنے والوں میں زور صاحب کا مقام بہت بلند ہے، انھوں نے اُردو شاعری میں دکن کے مقام کو روشناس کرایا اور اُردو کے ادب کو اونچا مقام دلایا۔ رگھوبندر راؤ جذب، اکبر الدین صدیقی، روحی علی اصغر، وحید مرزا، صلاح الدین نیّر نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ تینوں اداروں کی جانب سے پیش کردہ تعزیتی قرارداد دو منٹ کی خاموشی اور دعائے مغفرت کے ساتھ منظور کی گئی۔

شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی۔ ۲۹ر ستمبر ۶۲ء کو شعبۂ اُردو میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی اور نگراں ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد کی اچانک وفات پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں اساتذہ اور طلباء جامعہ نے شرکت کی۔

تعزیتی جلسہ کا آغاز صدر شعبہ اُردو ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی تقریر سے ہوا جنھوں نے مرحوم سے متعلق اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کیا اور زور صاحب کی جدائی پر اُردو ادب بالخصوص دکنی ادب کی ترقی کے راستہ میں آنے والی مشکلات کا ذکر کیا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر شعبہ اُردو جامعہ شبینہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم کی ادبی خدمات، دکنی ادب کے نوادر کی تحقیق، ادارہ ادبیات اُردو کا قیام اور اس کی نگرانی، مولانا آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام، دیوان قلی قطب شاہ اور دیوان زادہ کی از سر نو ترتیب و تدوین، داستان ادب حیدرآباد ایسے علمی اور زندہ جاوید کارنامے ہیں جو تاریخی اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ علمی اور ادبی ذوق کے علاوہ وہ زبردست تنظیمی صلاحیتوں کے بھی مالک تھے۔ کشمیر میں وہ اورینٹل لرننگ کے ڈین، ساہتیہ اکاڈمی اور رسالہ آج کل کے مشاورتی بورڈ کے ممبر بھی تھے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ افسوس زور صاحب کے انتقال سے آج حیدرآباد کی ادبی تاریخ کا ایک اور باب ختم ہو گیا۔

جناب مغیث الدین فریدی نے اپنے تاثرات غم کا اظہار اس قطعہ سے کیا۔

کون یہ ماجرائے درد کہے	دل زباں کا الٹ گیا افسوس
کیسا انسان ہو گیا رخصت	زور اُردو کا گھٹ گیا افسوس

ڈاکٹر تنویر احمد علوی، محترمہ نکہت جہاں اور جناب شریف احمد نے زور صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر تقریریں کیں اور تعزیتی تجویز پاس کی گئی۔

اُردو سوسائٹی حیدرآباد۔ ۲۸ر ستمبر ۶۲ء کو اُردو سوسائٹی (حیدرآباد) نے اپنا ایک ہنگامی اجلاس ڈاکٹر زور مرحوم کی تعزیت کے سلسلے میں طلب کیا۔ مرزا قادر علی بیگ قمر نے اجلاس کی صدارت فرمائی، اور تعزیتی تجویز پاس کی گئی۔

[illegible]

انجمن ترقی اردو شاخ گورکھپور

انجمن ترقی اردو شاخ گورکھپور کا ایک نمائندہ جلسہ لسانی کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنے کے لئے بتاریخ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۲ء شب میں زیر صدارت جناب حاجی الطاف حسین صاحب منعقد ہوا۔ یہ جلسہ کمیٹی کی سفارشات کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان سفارشات سے اپنی شدید بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے نیز اس افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ اس کمیٹی سے حامیان اردو نے جو توقعات وابستہ کی تھیں نہ صرف یہ کہ وہ پوری نہیں ہوئیں بلکہ ان سفارشات نے اردو کے مفاد اور اس کے کاز کو نقصان پہنچایا ہے بنا بریں یہ جلسہ حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان سفارشات کو کلیتاً مسترد کرکے اردو کا جائز حق تسلیم کرے، اور حامیان اردو کی بے اطمینانی کو رفع کرے۔ (اصغر عباس جوائنٹ سکریٹری)

انجمن ترقی اردو ویرم گام

مورخہ ۲۳ ستمبر کو مقامی شاخ کا پہلا سالانہ جلسہ جناب ایڈوکیٹ پیرزادہ صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سال گزشتہ کے حسابات و روداد عمل کی تفصیلی تقاریر کے بعد سنہ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء کے لئے مجلس انتظامیہ کا انتخاب ہوا۔ حسب ذیل اراکین باتفاق آراء منتخب ہوئے:-

(۱)	جناب شمس الدین پیرزادہ ایڈوکیٹ	صدر
(۲)	〃 جعفر بھائی پنارولا بی۔ اے	نائب صدر
(۳)	〃 میمن عبدالقادر مخلص	جنرل سکریٹری
(۴)	〃 فقیر محمد گھانچی۔ میونسپل کاؤنسلر	جوائنٹ سکریٹری
(۵)	〃 قاسم بھائی منڈل	خازن
(۶)	〃 عبدالمجید شیخ ایم اے	رکن مجلس
(۷)	〃 گل محمد میمن	〃
(۸)	〃 داؤد بھائی پٹیل۔ ایڈوکیٹ	〃
(۹)	〃 عبداللطیف میمن میونسپل کاؤنسلر	〃
(۱۰)	〃 حافظ محمد عباس بہورا	〃
(۱۱)	〃 شہاب الدین پیرزادہ	〃

(عبدالقادر مخلص)

بزم ادبیات اردو امراؤتی

بزم ادبیات اردو برائے سنہ ۶۳-۱۹۶۲ء گورنمنٹ کالج امراؤتی کا افتتاح ۲۰ ستمبر کو محب الحق صاحب نے کیا معتمد بزم نے سال گزشتہ کی رپورٹ سنائی اور آئندہ کے پروگرام کا خاکہ پیش کیا۔ اس کے بعد محب الحق صاحب نے ایک مختصر اور بصیرت افروز تقریر کی۔ آپ نے فرمایا کہ اردو کی ترویج و ترقی میں ہندوؤں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ہم لالہ ٹیک چند بہار، دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، بشن نرائن در، منشی طوطا رام شایاں، لالہ سری رام، برج نرائن چکبست، نوبت رائے نظر، سرور جہان آبادی، دیا نرائن نگم، کشن پرشاد کول، کیفی، منوہر لال زتشی، فراق گورکھپوری، کرشن چندر اور کنہیا لال کپور کی خدمات فراموش نہیں کرسکتے ہیں۔ یوروپین شعرا نے بھی اردو ادب کی خدمت کی ہے۔ یہ زبان دراصل ہمارا تہذیبی سرمایہ ہے۔ اس کی ترقی جذباتی ہم آہنگی کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ ان کی تقریر کے بعد معتمد بزم نے مہمان موصوف کا شکریہ ادا کیا اور جلسے کے برخاست ہونے کا اعلان کیا۔

انجمن معین الادب سہسرام

انجمن معین الادب سہسرام کی ماہانہ ادبی نشست جناب حشر سیمابی کی صدارت میں مورخہ ۲۰ ستمبر ۶۲ء کو منعقد ہوئی۔ انجمن کی سابق کارکردگی پر غور و خوض کیا گیا اور اراکین نے مختلف ادبی تخلیقات پیش کیں۔ مقامی کہنہ مشق شاعر جناب الیاس سہسرامی کی رحلت پر اظہار تاسف کیا گیا۔ جناب ڈاکٹر ایم اے، تمنا اور حشر سیمابی صاحبان نے مرحوم کی یاد میں اپنے اپنے قطعات بھی پڑھ کر سنائے۔ (کمال احمد اجیری)

بقیہ۔ دل کش جے پور

غیر ملکی سیاحوں کے لیے محلات آمیر، جو شہر سے چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہیں خاص دلکشی رکھتے ہیں۔ شہر سے زورآور سنگھ کے دروازے سے باہر نکلنے پر کچھ دور چل کر راستے میں دائیں جانب "جل محل" ہے جسے ۱۷۳۴ء میں بانیٔ جے پور نے بنایا۔ یہ محل "مان ساگر" تالاب میں واقع ہے اور ایک زمانہ میں اس کے چاروں طرف پانی بھرا رہتا تھا۔ تھوڑا آگے چل کر چڑھائی آتی ہے اور بہت کاریگری سے پہاڑ کاٹ کر سڑک نکالی گئی ہے۔ راستے میں کئی باغات ہیں۔ محلات آمیر کے نیچے ایک تالاب ہے جس کا نام "ماؤٹہ (Maota)" ہے۔ ان محلات کے پائیں باغ کا نام "دلآرام باغ" ہے۔ یہ مختصر سا مگر بہت خوش نما باغ ہے۔ آمیر تقریباً چھ سو برس کچھواہوں کی راجدھانی رہا۔ آمیر کا محل مہاراجہ مان سنگھ نے ۱۵۹۲ء میں تعمیر کرنا شروع کیا اور ان کے عہد میں ۱۶۱۵ء تک تعمیر جاری رہی۔ مرزا راجہ جے سنگھ نے کچھ اضافہ کیا اور مہاراجہ سوائے جے سنگھ ثانی بانیٔ جے پور نے اٹھارویں صدی میں مکمل کیا۔ اس کے دیوان خاص کا دروازہ اپنی صناعی میں مشہور ہے اور دیوان خاص، دیوان عام جس کے چالیس ستون ہیں اور شیش محل خاص طور سے قابل دید ہیں۔ محل کی حفاظت کے لئے پانچ سو فٹ اونچی پہاڑی کی چوٹی پر "جے گڑھ" کا قلعہ بنا ہوا ہے یہ قلعہ ۱۷۲۶ء میں تعمیر ہوا۔ محلات آمیر میں "شلا دیوی" کا مندر ہے یہ تین سو سال سے زیادہ کا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۶۰۴ء میں ہوئی تھی۔ موجودہ دور میں قصبہ آمیر زیادہ بارونق نہیں ہے البتہ "جگت شرومنی" کا مندر جو ۱۶۰۰ء کا تعمیر کردہ ہے قابل دید ہے۔ اس کا تورن جو ہندو طرز کا ہے بہت خوبصورت ہے۔

ایک انگریز سیاح آمیر کے متعلق کہتا ہے:۔

"محل اور دل فریب تاثرات، تیز و تند حسن تو ساتھ کے اعتبار سے میں کسی دیگر شے کو آمیر کے مقابلہ میں نہیں پیش کر سکتا۔"

آمیر سے واپسی پر اگر جوہری بازار ہوتے ہوئے سانگانیر دروازہ کی طرف جایا جائے تو اس بازار میں جو جے پور کا سب سے بڑا بازار ہے دونوں طرف ایک وضع قطع اور ایک رنگ کی دوکانات اور مکانات نظر آئیں گے۔ پہلے دکانوں کے سامنے چبوترے بنے ہوئے تھے مگر تقریباً دو برس قبل ہٹا دئیے گئے ہیں۔ جوہری بازار اتنا کشادہ نہیں جتنا ترپولیہ بازار ہے مگر جیسا اس کا نام بتاتا ہے یہاں جواہرات اور سونا چاندی کی تجارت ہوتی ہے گو اور سامان بھی بکتا ہے۔

سانگانیر دروازہ سے نکل کر سامنے رام نواس باغ ہے۔ یہ یہاں کا سب سے بڑا عام باغ ہے جسے ۱۸۶۸ء میں مہاراجہ سوائے رام سنگھ نے بنایا۔ اس میں چڑیا خانہ بھی ہے اور ایک عجائب خانہ بھی جسکی تعمیر ۱۸۷۶ء میں شروع ہوئی اور جس کا افتتاح ۱۸۸۷ء میں ہوا۔ عجائب خانہ کی عمارت بہت خوش نما ہے۔ اس کے گنبد، چھتریاں اور جالیدار بالاخانے دور سے نظر آتے ہیں۔ دیواروں پر رنگین تصاویر ہیں اور عجائب خانہ میں بہت اچھا ذخیرہ، زمانہ قدیم، زمانہ وسطی اور زمانۂ حال کے فنون دستکاری کا ہے۔

باغ کی سیر کرنے کے بعد اگر مغربی دروازہ سے باہر آیا جائے تو سامنے ہی "مہارانی گایتری دیوی گرلز پبلک سکول" کی جدید طرز کی عمارت ہے اس سے آگے لڑکیوں کا کالج، اور سڑک کی دوسری جانب مہاراجہ کالج کی شاندار عمارت اور آگے چل کر مان سنگھ ہسپتال کی عالیشان عمارت ہے جس کے مشرق میں مان سنگھ میڈیکل کالج ہے۔ یہ تمام عمارتیں زمانہ حال کے فن تعمیر کے نمونے ہیں۔

اسی سڑک پر اور آگے چل کر "رام باغ محل" ہے اس محل کی تعمیر موجودہ والیٔ جے پور کے جد امجد مہاراجہ سوائے رام سنگھ نے شروع کی اور اس کی تکمیل موجودہ مہاراجہ نے کی۔ اس کا باغ دور دور اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اب یہ ایک اعلیٰ قسم کا ہوٹل ہے۔ رام باغ کے سامنے مشرق میں ایک پہاڑی پر "موتی ڈونگری" کا قلعہ ہے جسے اب تخت شاہی کہتے ہیں۔ جب کسی تقریب کے موقع پر رات کو اس قلعہ پر روشنی ہوتی ہے تو بڑا خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ نہارگڑھ کا قلعہ اور موتی ڈونگری کا قلعہ ریل میں سے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

جے پور کے مشرق میں ایک اور دلچسپ مقام ہے "گلتہ" کی خوبصورت گھاٹی ہے۔ گلتہ ہندوؤں کا متبرک مقام ہے۔ سڑک پیچ و خم کھاتی ہوئی اوپر پہاڑی تک پہنچتی ہے۔ اوپر سے شہر کا بڑا خوشنما منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہ گھاٹی اوپر سے نیچے تک حوضوں اور مندروں سے پُر ہے۔ گئو مکھ سے پانی آتا ہے۔ گلتہ کے سورج جی کے مندر کی دیواروں پر خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ آگرہ کی سڑک پر ایک اور گھاٹی ہے اسے پرانا گھاٹ کہتے ہیں۔ یہ گھاٹی تقریباً ایک میل لمبی ہے۔ دونوں طرف خوش نما پہاڑیاں ہیں۔ شمال میں ایک پہاڑی پر "آما گڑھ" کا قلعہ ہے۔ گھاٹ کا قدرتی منظر بڑا دلفریب ہے۔ پرانے گھاٹ میں بہت سے باغات اور محلات ہیں بعض عمارتیں آمیر میں راجدھانی قائم ہونے سے پہلے کی ہیں۔ سب سے مشہور باغ "راج نواس" اور "ودیا دھر" ہیں۔ مہاراجہ رام سنگھ برسات میں اکثر یہاں قیام کرتے تھے۔

شہر جے پور کے جنوب میں آٹھ میل کے فاصلے پر سانگانیر کا مشہور اور تاریخی قصبہ ہے۔ یہاں ایک مشہور جین مندر گیارہویں صدی کا بنا ہوا ہے جو آبو کے مشہور "دلواڑہ" مندر کی طرز کا ہے۔ سانگانیر کاغذ سازی اور رنگائی کے کام کے لئے مشہور ہے۔

جے پور میں صرف عمارتیں ہی دیکھنے کے قابل نہیں ہیں یہاں کی دستکاری خاص توجہ کے قابل ہے۔ نگینہ سازی میں جے پور ایشیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ سونے پر میناکاری میں جے پور ہندوستان بھر میں مشہور ہے۔ پیتل کا کام بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی کھدائی، کندہ کشی یا خاک کی مٹی کے کھلونے، کپڑے کی رنگائی اور چھپائی اور قالین مشہور ہیں اور پتھر کے کھلونے اور مورتیاں دور دور جاتی ہیں۔

جے پور میں ہر مذہب و ملت کے لوگ بستے ہیں مگر ان میں آپس میں اتفاق اور اتحاد ہے۔ اور تاریخ کے ہر دور میں جے پور میں امن امان کا دور دورہ رہا ہے۔ جے پور اس معاملے میں بھی سربلند ہے یہاں کے شہریوں کے لباس کا رنگ یا ساخت مختلف ہو سکتی ہے، مگر بول چال تقریباً ایک سی ہے۔ اور جے پور والوں کی ہر ادا سے اختلاط اور محبت ٹپکتی ہے۔

الغرض ہر اعتبار سے جے پور سیاحوں کے لئے بے شمار دلچسپیاں رکھتا ہے۔ جے پور ایک دلکش اور رومانی شہر ہے۔

ضیاء احمد بدایونی

تبصرے

نوائے کفر و ادائے کفر

از منور لکھنوی۔
اوّل الذکر کی قیمت ۲/۵۰
آخرالذکر کی قیمت ۱/۵۰
ناشر۔ آدرش کتاب گھر۔ فیض گنج دریا گنج۔ دہلی۔

جناب منور لکھنوی جواب لکھنوی سے زیادہ دہلوی ہیں اُردو کے اساتذہ میں ہیں۔ وہ ستھرا ادبی مذاق رکھتے ہیں اور ایک علمی و ادبی خانداں کے فرد ہیں۔ منور صاحب کی تخلیقات اور تراجم متعدد ہیں اور ملک سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ خصوصاً ان کا منظوم ترجمۂ گیتا نہایت مقبول و مشہور ہے۔ ایسے تراجم سے ایک طرف ہماری زبان کا دامن مالا مال ہوتا ہے، دوسری طرف ملک کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے اور رواداری کا سبق سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔ نوائے کفر و ادائے کفر موصوف کی غزلوں کے انتخابات ہیں۔ معلوم نہیں یہ نام انھیں کیوں پسند آئے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ان کے یہاں ایسے ایمان افروز شعر بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں ؎

ذرا سنبھل کے منور ہے مرحلہ نازک خودی کے جوش میں اگر خدا نہ ہو جانا

علیٰ ہذا۔ صبا میں ہے جو لطافت تری لطافت ہے
جمال ہے جو گلوں میں ہے وہ جمال ترا

منور کی غزلیات کی ایک بڑی خصوصیت ان کے جذبات کا ٹھہراؤ اور احساس کی لطافت ہے غزل میں یوں بھی کرختگی کی کوئی جگہ نہیں۔ پھر ان کی غزلوں کو پڑھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ندی کسی میدانی علاقے سے دبے پاؤں گذر رہی ہو، اسی کے ساتھ ان کے یہاں درد و الم کی ایک ہلکی سی کسک بھی پائی جاتی ہے جس سے تصنع نہیں۔ بلکہ دردمند دل کا سُراغ ملتا ہے۔ کلام اول سے آخر تک پڑھ جائیے۔ ابتذال یا پست مذاقی نام کو نہیں۔ مانا کہ بعض جگہ روایتی انداز سا نظر آتا ہے۔ تاہم خیال کی پاکیزگی عموماً دامن دل کھینچتی ہے۔ زبان و بیان کی صحت و صفائی کے بارے میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ جناب منور لکھنؤ کے ایک ایسے خاندان سے نسبت رکھتے ہیں جو عرصے سے ادب کی خدمت کرتا رہا ہے۔ اس موقع پر ہم جناب نیاز فتح پوری کی عبارت نقل کرنے پر اکتفا کریں گے وہ رقمطراز ہیں:- "منور صاحب سرزمین لکھنؤ کے فرزند ہیں، اور نہ صرف اپنے مزاج اور کلچر بلکہ اکتساب علمی کے لحاظ سے بھی وہ اس وقت کے انسان ہیں جب زندگی نام تھا شرافت نفس اور نفاست ذوق کا۔ اور انھیں فطری خصوصیات کے ساتھ وہ دنیائے ادب میں آئے اور اب تک انھیں نباہے جا رہے ہیں۔"

گلبن

مصنفہ ڈاکٹر صفدر آہ
قیمت۔ ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ۔ کتاب کدہ۔ ۱۴۰۔ والکیشور روڈ۔ بمبئی نمبر ۶۔

ڈاکٹر صاحب کے کلام پر اس سے پہلے 'ہماری زبان' میں تبصرہ آ چکا ہے۔ گلبن ان کی نظموں کا مجموعہ ہے، جس میں موجودہ زندگی کے نئے مسائل (ایشیا، نئی قدریں، اسپتنک، بغاوت، انقلاب، آزادیِ ہند وغیرہ) پر جدید انداز میں اظہار رائے کیا گیا ہے۔ موصوف شعر و سخن میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں اور ان کا کلام ندرت خیال و جدت بیان کی خصوصیات کا حامل ہے۔ لیکن ان کے یہاں قدیم نظام سے یکسر بیزاری اور جدید سے مکمل وفاداری کا جذبہ عام ہے جو درست نہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں ؎

دب گئے خاک کی اُگتی ہوئی تہذیبوں سے
آسمانوں سے وہ آئے ہوئے اقدار کہن

یا۔ چند امکاں کی حدیں بن کر دھواں خود اڑ گئیں
نازشِ عہد کبریائی ہو گیا فرقِ نیاز

سچ پوچھئے تو آج اگر دنیا میں کہیں نیکی اور سچائی کا وجود ملتا ہے تو وہ آسمانی تعلیمات ہی کا کوئی دھندلا سا نقش ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ جدید دنیا اپنی اَن گنت بیانہ ترقیات کے باوجود اب روحانی تو درکنار، مادی راحت و سکون سے بھی محروم ہوتی جا رہی ہے۔ جس کی تصدیق خود ترقی یافتہ ممالک کے اعداد و شمار سے ہوتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک نظم میں جس کا عنوان 'انقلاب' ہے لکھتے ہیں ؎

ہونے والا ہے ظہور آفتاب صبح نو
خوں اُبلتا ہے شفق سے آسماں ہے لال لال
ہے تقاضائے بارش شبنم بو میں بو بارود کی
اور اس تخریب کے پیچھے ہے تعمیری مآل

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تشدد آمیز اور خونیں انقلاب کے حامی ہیں جو مذہب کے لئے تشدد کا الزام اب تک مذہب کے سر تھا۔ مگر یہ الٹی گنگا کیسی؟

پبلشر، مدیر، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا